AL-IDRAK RESEARCH JOURNAL

OPEN ACCESS
Al-Idrak
Research Journal
ISSN (Online): 2789-3227
ISSN (Print): 2789-3235
www.alidrakresearchjournal.com

جدید اخلاقی بحران کی فکری بنیادیں

The Intellectual Foundations of the Modern Ethical Crisis

☆ **Dr. Muhammad Rasheed Arshad**
Assistant Professor, Department of Philosophy, University of the Punjab, Lahore, Pakistan.

Citation:
Arshad, Dr. Muhammad Rasheed " The Intellectual Foundations of the Modern Ethical Crisis." Al-Idrāk Research Journal, 4, no.1, Jan-Jun (2024): 73– 84.

ABSTRACT

The modern world is full of issues and diseases of all types. The moral crises of the modern world are among the deadliest diseases. The greatest obstacle facing religion, after faith, is ethics. This article makes an effort to comprehend the historical context and intellectual foundations of these moral dilemmas. Comprehending the theoretical underpinnings of these problems is crucial for promptly identifying and resolving societal issues. Although ideas and theories have external influences, it can be difficult to determine how these factors affect societal and cultural contexts. Thus, in order to fully comprehend and address urgent societal concerns, a critical analysis of important ideas and theories is required.

Keywords: Modern World, Moral Crises, Historical Context, Intellectual Foundations.

تعارف

جب آدمی کسی مرض میں مبتلا ہو جائے تو معالج سب سے پہلے عیاں علامت کا معائنہ کر کے لاحق مرض کی تشخیص کرتے ہوئے مرض کے اسباب کی نشاندہی کرتا ہے۔ بعد ازاں لاحق مرض سے نجات کے لیے پرہیز یا ہدایات تجویز کی صورت میں فراہم کی جاتی ہیں۔ فرد کی طرح ایک معاشرہ بھی کئی طرح کے امراض میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ معاصر جدید معاشرے کو لاحق امراض کی علامات، جنھیں چارلس ٹیلر نے مجموعی طور پر جدیدیت کی گھبراہٹ (malaise of modernity) کا عنوان دیا، کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ البتہ ان کی درست تشخیص اتنی واضح نہیں ہے۔ چونکہ جدیدیت کے موجودہ مظاہر کی داستان فکری تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، اس لیے جدید دور

میں تشویش ناک حد تک پروان چڑھ چکے سماجی مسائل کی بروقت تشخیص کے لیے ان کی فکری بنیادوں سے آشنائی بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ افکار و نظریات خارج پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کہے میں کسی شک کی گنجائش بھی نہیں۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ انتہائی گہرے اثرات کے حامل افکار و نظریات سے بسا اوقات صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے۔ یہ فکری بنیادیں ہمارے شعور کی داغ بیل ڈالتے ہوئے ہماری روزمرہ زندگی کے معمولات کو متعین کرتی ہیں۔ ان کی مدد سے ہم ظہور پذیر ہونے والی اشیا کے بارے تعینات قائم کرتے ہیں اور امکاناتِ زیست کی حد بندی کرتے ہیں۔ ایک نظریہ جتنا زیادہ موثر ہو گا اتنا ہی اس کے ادارہ جات، روایات اور خیالات میں سرایت کر جانے کے قوی امکان موجود ہوں گے۔ ایسے تمام نہایت اہم افکار و نظریات کی جانچ پڑتال کرنا اور ان پر کوئی رائے پیش کرنا ایک دقت طلب کام ہوتا ہے۔ اگرچہ افکار و نظریات کے خارج پر اثرات تو واضح ہوتے ہیں لیکن ہم عموماً اپنے سماجی اور ثقافتی حالات و واقعات کے پیچھے کارفرما اُن افکار و نظریات کی نشاندہی بہ آسانی نہیں کر پاتے۔

چند تمہیدی باتیں

معاصر جدید دنیا میں گوناگوں مسائل نظر آتے ہیں اور اسے طرح طرح کی امراض لاحق ہیں۔ ان میں سب سے مہلک مرض جدید دنیا کا اخلاقی بحران ہے۔ زیرِ نظر تحریر میں بالخصوص جدید اخلاقی بحران کی فکری بنیادوں کو سامنے لانے کی کوشش کی جائے گی۔ جو اثرات، علامات کی صورت میں نظر آ رہے ہیں، ان کی فکری بنیادوں تک رسائی کے ساتھ ساتھ اس تاریخی سیاق و سباق کو سامنے لانا بھی ضروری ہے جس میں ان افکار نے جنم لیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنی نشو و نما کرتے رہے۔ اقبال اجمیری[1] کے شعر میں خوب صورتی سے اس امر کو بیان کیا گیا ہے:

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

جہاں جدید افکار نے ماضی کی روایات، نظریات، رسومات اور اقدار کو اپنے انداز سے مسخ کیا، وہیں ادیان بھی ان کی یلغار سے بچ نہ سکے۔ ایمانیات کے بعد دین کو سب سے بڑا چیلنج اخلاقیات کے شعبے میں درپیش ہے۔ جدید

[1] Qabil Ajmeri, "Vaqt Kartaa Hai Parvarish Barson," in Rekhta, accessed February 10, 2024, https://www.rekhta.org/couplets/vaqt-kartaa-hai-parvarish-barson-qabil-ajmeri-couplets-3?lang=ur.

مغرب نے نفسِ انسانی کی تمام سطحوں سے خدا کی بے دخلی کا جو منظم منصوبہ بنایا تھا اس میں ذہن کو ایمان سے نامانوس کر دینا، اخلاق کو ارتقائی عمل کا نتیجہ قرار دے کر طبیعت کے اخلاقی جوہر کو غیر مذہبی بنا دینا اور ان دونوں کے نتیجے میں پورے انسانی نصب العین کو بدل کر رکھ دینا تھا۔ یہ اس منصوبے کے خاص الخاص مقاصد تھے۔[1]

دینی حلقوں کی کوتاہی

یہ بات بجا ہے کہ جدید افکار نے اپنے منفی اثرات سے سابقہ روایت کی اعلیٰ اقدار کی شکست و ریخت میں اہم کردار ادا کیا، تاہم اپنے حصے کی کوتاہی سے صرفِ نظر بھی خوش آئند نہیں۔ بقول سلیم احمد[2]:

میں وہ سفاک آنکھیں ڈھونڈتا ہوں
جو خود کو دیکھنے کی تاب لائیں

بد قسمتی سے دینی روایت جس میں اسلامی روایت بھی شامل ہے، ایمان، شعور، اخلاق اور طبیعت کے تلازمات پر زیادہ توجہ نہ دی جا سکی۔ ان سب سے آدمی کے اخلاقی وجود کو بھی، جو اپنی ساخت میں ظاہر دین سے جڑ کر نشو و نما پانے اور اپنے مربوط اور تخلیقی اظہار کا موقع نہ مل سکا۔ مذہبی ذہن کی کم از کم دو صدیوں سے یہ عالمگیر کوتاہی اور پسماندگی ہے کہ اس نے دینی ڈسکورس کے ایک لازمی کردار یعنی "تغیر کی خو رکھنے والے آدمی" کو سرے سے نظر انداز کیے رکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آدمی کا ذہن اور اس کی دنیا تبدیلی کے جبری اور فطری نظام کے تحت بدلتی رہی، لیکن تبدیلی کی اس رو کی باگ دین کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ انسانی اجتماعیت کے نئے نئے ادارے بنتے رہے اور ان میں وسعت اور پیچیدگی پیدا ہوتی رہی، مگر مذہبی ذہن اور کردار اس سارے عمل سے لاتعلق رہا۔ اسے یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ خاص طور پر اخلاق اگر اجتماعیت کی فعال اساس نہ بنیں تو یہ محض شاعرانہ تصورات بن کر رہ جاتے ہیں، جن کی آدمی کو فی الواقع کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ نئے سماجی اور اجتماعی رشتوں نے اپنے جواز اور بقا کے لیے ایک ایسا اخلاقی در و بست ترتیب دیا جس کے نتیجہ خیز طور پر عمل میں آنے کے بعد یہ سوال رفتہ رفتہ زیادہ سنگینی اختیار کرتا چلا گیا کہ، "آدمی کو اپنی اخلاقی رہنمائی کے لیے آخر مذہب کی ضرورت ہی کیا ہے؟"۔ جدید مغرب نے

---

[1] Ryan McKay, and Harvey Whitehouse, "Religion and Morality," *Psychological Bulletin* 141, no. 2 (2015): 447.

[2] Saleem Ahmed, "Saleem Ahmed recites his Ghazal - From Audio Archives Lutfullah Khan," YouTube video, 00:02:09, Khursheed Abdullah, uploaded Jun 25, 2022, https://www.youtube.com/watch?v=akh14-zbNI4.

اخلاق میں ایک تنظیمی مضبوطی اور قانونی پھیلاؤ پیدا کر کے یہ دکھانے کی کاوش کی کہ اخلاق کے فطری اور آفاقی اصول کسی بھی مابعد الطبیعی سیاق وسباق سے نہ صرف یہ کہ آزاد ہیں، بلکہ یہ آزادی ہی آفاقی اخلاقی اقدار کے قیام کا سبب اور ان کے تغیر آشنا تسلسل کی ضامن ہے۔[1] مذہب اپنے structural تحکم کی وجہ سے ذہن اور اخلاق کی حرکت کو روک دیتا ہے جس کے نتیجے میں نئے اصول اور ان کے تازہ اطلاقات کی پیدائش کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔[2] اوپر سے اہلِ مذہب نے مکمل طور پر غیر موثر ہو جانے کے بعد انسان اور دنیا پر اپنا تصرف بحال کرنے کے لیے جو علمی اور اخلاقی کوششیں کیں وہ اتنی فرومایہ بلکہ غیر انسانی تھیں کہ انھیں دیکھ کر وہ لوگ بھی مغربی تصوراتِ علم و اخلاق سے متاثر ہونے پر مجبور ہو گئے جن کا مغربی تہذیب سے تعلق نہ تھا۔[3] موجودہ زمانے میں یہ صورتِ حال غالباً اپنی قبیح ترین شکل میں سامنے آچکی ہے۔ اب کسی راسخ العقیدہ مخلص مسلمان کے لیے بھی یہ کہنا ممکن نہیں رہا کہ اہلِ اسلام اپنے ہی مسلمہ اخلاقی معیارات پر مغرب کی برابری کر سکتے ہیں۔ یہ اس بحران کا انتہائی درجہ ہے کہ دین سے سنجیدہ اور مخلصانہ وابستگی رکھنے والے خدا ترس لوگ ایک ذہنی اور اخلاقی کم تری کے احساس میں مبتلا ہو چکے ہیں، اور اس سے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں پاتے۔

جدید تصورات پر استوار دنیاے جدید کا تار و پود

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مغرب اپنی تہذیبی برتری کو دنیا سے منوانا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ کوئی بھی حربہ استعمال کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کے علمی و اخلاقی زوال کے تقریباً تمام مظاہر مغرب ہی کی سوچی سمجھی تخلیقات ہیں جن کو مسلمان اپنے دینی شعور اور مزاج میں بگاڑ آجانے کی وجہ سے پہلے تو سمجھ نہ سکے اور جب مغرب کا یہ تخریبی کردار سمجھ میں آگیا تو اس کے ازالے کی کوئی موثر قوت مسلمانوں کے پاس نہیں تھی۔ چونکہ ہم اخلاقیات کے مخصوص پہلو سے جدید افکار کے مضر اثرات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس لیے آئندہ صفحات میں ہم دنیائے جدید کی نقشہ گری کرنے والے ان جدید تصورات کا جائزہ پیش کریں گے جنھوں اخلاقیات کے شعبے میں در

---

[1] Kai Nielsen, "Some Remarks on the Independence of Morality from Religion," *Mind* 70, no. 278 (1961): 175-86.

[2] Nadine Sika, "Dynamics of a Stagnant Religious Discourse and the Rise of New Secular Movements in Egypt," in *Arab Spring in Egypt*, ed. Bahgat Korany, and Rabab El-Mahdi (American University in Cairo Press, 2012): 63-82, https://doi.org/10.5743/cairo/9789774165368.003.0005

[3] Johannes J. G. Jansen, *The Dual Nature of Islamic Fundamentalism* (Hurst, 1997).

اندازی کرتے ہوئے اخلاقی بحران کو اس نہج تک پہنچادیا ہے۔

سیکیولرازم

سیکیولرازم کے نقاد سیکولر فکر اور اخلاقی انحطاط میں پائے جانے والے ربط کی نشاندہی کرتے ہیں۔ 1948ء میں ایک امریکی مضمون نگار رچرڈ ویور نے لکھا، کہ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ جدید آدمی اخلاقی سطح پر خبط کا شکار ہے۔[1] وِیور کے نزدیک اس کا سبب ماورائی وجود کی حقانیت اور بذاتِ خود سچ اور صداقت کا انکار ہے۔ جدید فکر میں انسان کو ہر معیار بہ شمول اخلاقی معیار کو طے کرنے کے اختیارات کی دستیابی کے ساتھ ہمہ گیر اخلاقی اقدار کا خاتمہ ہونا شروع ہوا جس کے نتیجے میں معاشرت میں موضوعیت، نرگسیت اور انانیت جیسے مہلک انسانی رویوں نے جنم لیا۔ فرد کو آزاد خود مختار متصور کر کے جدید اخلاقیات میں انانیت پسندی کے فلسفے نے اپنے لیے جگہ بنائی۔ اخلاقیات میں انانیت پسندی ایک ایسا فلسفۂ اخلاق ہے جو انفرادی مفادات کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دیتے ہوئے فرد کو خود غرضانہ انداز میں محض اپنی بھلائی، افادے اور مسرت کے کاموں کو سرانجام دینے کی تلقین کرتا ہے۔ اس نظریے کے تحت فرد کے لیے اولین اخلاقی فریضہ ذاتی خواہشات کی تکمیل ہے۔ اخلاقیات کا یہ نظریہ اجتماعی معاشرے کی اقدار؛ مثال کے طور پر فلاحِ عامہ، عدل وانصاف اور مجموعی معاشرت کی بہتری کی راہ میں حائل بہت بڑی رکاوٹ کے طور پر سامنے آتا ہے۔ انانیت پسندی میں فرد کی مرکزیت پہ پُرزور تاکید کی وجہ سے یہ اخلاقی فلسفہ تمام روایتی نظریات سے کٹ جاتا ہے۔ فرد کی فطرت کی خود غرضانہ جہت کو اس نظریے نے تقویت پہنچائی اور اخلاقیات کے تمام شائستہ اصولوں کو تہس نہس کرتے ہوئے معاشرے میں بگاڑ پیدا کیا۔ اپنی کتاب After Virtue میں میک انٹائر نے یہ مقدمہ پیش کیا ہے کہ یورپ اخلاقی سطح پر تباہ وبرباد ہو کر نظری اور عملی دونوں حوالوں سے اخلاقیات سے محروم ہو چکا ہے۔[2]

مغربی ثقافت میں اخلاقیات کے ساتھ ہونے والے کھلواڑ کے نتیجے میں اب وہاں کوئی مربوط اخلاقی نظام وضع نہیں کیا جاسکتا۔ جدید اور مابعد جدید پیرائے میں دیکھا جائے تو مغربی معاشرہ ایک ایسے دور سے گزر رہا ہے جہاں ہمہ گیر صداقت، اخلاقی اصول اور تقدیس نامی کسی شے کا وجود تک باقی نہیں ہے۔ ہمہ گیریت اور ماوروائیت کے انکار کے

---

[1] Richard Weaver, *Ideas Have Consequences* (University of Chicago Press, Chicago, 1948), 187.

[2] Alasdair MacIntyre, *After Virtue* (University of Notre Dame Press, 1981), 2.

ساتھ افراد کے رویوں میں پیدا ہونے والے غیر انسانی اوصاف نے سرزمینِ مغرب کو بہ حیثیت مجموعی اخلاق باختہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ خدا کے انکار سے پیدا ہونے والے خلا کو انسان دوستی یا انسان مرکزیت کے فلسفہ سے پُر کیا گیا۔ لیکن دیکھا جائے تو خدا سے انکاری سماج کے لیے انسان دوستی ہی واحد متبادل نہیں ہے بلکہ ایک راہ Nihilism کی جانب بھی جاتی ہے۔ وجودی Nihilism کی رُو سے انسانی زندگی معنویت سے خالی ہے، جبکہ اخلاقی Nihilism کی رُو سے ہمہ گیر اخلاقی ضابطے کا کہیں وجود نہیں یہ محض انسانی معاشروں کی اختراع ہے تاکہ وہ اس بے معنی دنیا میں گزر اوقات کو ممکن بنا سکیں۔ Nihilism اس بات کو سامنے لاتی ہے کہ زندگی سے متعلقہ وجودی نوعیت کے سوالات کا کبھی تشفی بخش جواب فراہم ہی نہیں کیا جا سکتا[1] کیونکہ ازلی اور ابدی سچائی کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ اس فکر کے ماننے والوں کے نزدیک انسان دوستی کا فلسفہ بھی مذہبی اقدار سے اخذ کردہ التباس کے سوا کچھ نہیں۔ اگر دیکھا جائے تو معاصر تہذیب مغرب کی درست نمائندگی سیکیولر انسان دوستی کی بجائے Nihilism کر رہی ہے جو کسی بھی اخلاقی ضابطے کو کسی بھی صورت تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ تاریخِ فلسفہ کے مطالعے سے یہ باور ہو گا کہ Nihilism؛ سائنس پرستی، متشدد اضافیت پسندی اور ہمہ گیر سچائیوں کے مابعد جدید انکار کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ 1970ء کی دہائی میں امریکہ میں پھیلی سیریل کلنگ میں ملوث مجرمان کے بیانات سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ کیسے اخلاقی اضافیت پسندی اور Nihilism ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے ہیں۔

جدید تصورِ عقل

جدیدیت کا پہلا نمائندہ فرانسیسی فلسفی رینے ڈیکارٹ کو سمجھا جاتا ہے۔ جس نے قبل از جدید خدا مرکزیت کی حامل بادشاہت اور کلیسا کے اختیارات کو علمیات کی بنیاد پر انسان مرکزیت کی حامل موضوعیت سے بدل دیا۔ مافوق الفطرت الوہی ذات کا تصور خارج از بحث ہو گیا اور اختیارات کی مرکزیت خود مختار انسانی عقل کے ہاں منتقل ہو گئی۔[2] اگرچہ رینے ڈیکارٹ خدا پر ایمان رکھتا تھا، تاہم یہ کہنا کہ ڈیکارٹ کی فکر نے تشکیک پسندی، لاادریت اور الحاد کے بیج بوئے، تو بجا ہو گا۔[3]

---

[1] Karen L. Carr, *The Banalization of Nihilism: Twentieth Century Responses to Meaninglessness* (State University of New York Press, 1992), 18.

[2] H. White, *Postmodernism 101: First Course for the Curious Christian* (Grand Rapids: Brazos Press, 2006), 41f.

[3] Alister E. McGrath, *The Making of Modern German Christology, 1750-1990*, 2nd ed.

ڈیکارٹ کی علمیات سے عقلیت کو روایتی، مذہبی اور الہامی کلام کے اوپر غلبہ حاصل ہوا۔ ذہن اور جسم کی دوئی سے مذہب کو مادی دنیا کے معاملات سے بے دخل کر دیا گیا۔ تاہم، اگر عہدِ وسطیٰ کے فکری تاریخ کا بھی جائزہ لیں تو علمیات میں بتدریج تبدیلی نے عہدِ وسطیٰ سے اخلاقیات کو اپنے طور پر متاثر کیا ہے۔ تھامس اوقیناس نے دومابعد الطبعی حلقوں طبیعی فطرت (nature) اور grace کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق طبیعی فطرت کو ہم اپنے حواس خمسہ کی معلومات اور معقولات کو تصرف میں لاکر جان سکتے ہیں۔ لیکن اس طبیعی فطرت سے ماوراء ایک حقیقت ہے جسے صرف وحی کی روشنی میں جانا جاسکتا ہے۔ یعنی grace کے زمرے میں الوہی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے جب کہ طبیعی فطرت پر فطری قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ اوقیناس کی قائم کردہ اس دوئی نے بعد کی مغربی فکر میں ایک نیا تصور متعارف کروایا۔ الوہی قوانین کے ماتحت grace کو وحی سے جب کہ فطری قوانین کے ماتحت طبیعی فطرت کو حسیات اور عقل سے جانا جاسکتا ہے۔ روزمرہ زندگی کے اخلاقی اعمال میں اوقیناس نے انسانی عقل کے عمل دخل کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ وحی کی رہنمائی کی حاجت روزمرہ معمول سے ہٹ کر روحانی سرگرمیوں کی انجام دہی میں پڑتی ہے۔ تحریک روشن خیالی کی فکر میں خود مختار انسانی عقل کا درجہ مذہبی احکامات اور وحی سے بلند قرار پایا۔ انسانی عقل کو معیار بناتے ہوئے ایمانیات اور معجزات وغیرہ کو غیر عقلی قرار دے کر ان کا انکار کر دیا گیا۔

ازمنۂ وسطیٰ میں وحی کی رہنمائی کے بغیر عقل کو مہمل کہا گیا، جبکہ جدید دور میں عقل کی رہنمائی کے بغیر وحی کو مہمل قرار دیا گیا۔ جدید تصورِ عقل آلاتی عقل یعنی instrumental reason کا داعی ہے۔ مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے بطور آلہ مستعمل عقل کو فلسفیانہ اصطلاح میں آلاتی عقل کہا جاتا ہے۔ جہاں یہ تصورِ عقل جدید سائنسی انقلاب اور فنیات کی ترقی کے لیے ممد و معاون ثابت ہوا وہیں اس نے تاریخِ انسانیت کے کئی المناک حادثات کو بھی جنم دیا ہے۔ جدیدیت کا یہ مقدمہ رہا ہے کہ ماضی کی توہم پرستانہ روایات سے آزادی، متروکہ خیالات سے قطع تعلقی اور بربریت سے نجات جدید تصورِ عقل یعنی instrumental reason کی رہنمائی میں ممکن ہو پائی۔ جدید دنیا کے معاشیاتی، سیاسیاتی اور انتظامی ڈھانچوں میں آلاتی عقل کے تصرف کے منفی رُخ کو مابعد جدید مفکر اور فلسفی فوکو اور ہیبرماس نے اپنی تحاریر میں مفصل انداز سے بیان کیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی انسانی رویوں اور اخلاقیات پر اس طرزِ ذہنیت کے مہلک اثرات پڑے ہیں۔ آلاتی عقل کی پیروی میں انسان جذبات اور

(Apollos, 1994), 7.

احساسات سے عاری ہوتے ہوئے اپنے گرد و نواح اور فطرت سے قائم زندہ تعلق سے ہاتھ دھو بیٹھا۔
میکن ٹائر کے مطابق اخلاقیات کو تعقلات پر قائم لبرل اقدار کے تابع کرنے کا مشن بری طرح ناکام ہو کر ثقافتی اضافیت پسندی پر منتج ہوا۔[1] جب کسی مافوق الفطرت واحد ہستی کو انسانی معاملات سے بے دخل کر کے انسان کے خود ساختہ اصول و ضوابط کو رہنما تسلیم کر لیا گیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ متفرق خطوں کے، مختلف تاریخی سیاق و سباق اور جدا جدا امکانی و زمانی وابستگیوں کے حامل لوگوں کے مختلف نظریات کی بنیاد پر بنائے جانے والے اصول و ضوابط میں پائے جانے والے فرق کی وجہ سے کیا کوئی ہمہ گیر اصول بنایا جا سکتا ہے؟ اضافیت پسندوں کا ماننا ہے کہ سچائی نہ تو ہمہ گیر ہے اور نہ ہی مستقل، بلکہ جغرافیائی، تاریخی اور ثقافتی حوالوں سے بدلتی رہتی ہے۔ اخلاقیات میں اضافیت پسندی کی ترویج پر بہت سے اخلاقی فلاسفہ نے شدید مخالفت کی لیکن اس کے باوجود اس میں ایک کشش کا ایک ایسا پہلو موجود ہے جس پر کوئی دو رائے نہیں پائی جاتی۔ اور وہ پہلو ہے: مختلف ثقافتی اور نظریاتی پسِ منظر کے لوگوں کے ساتھ احسن سلوک سے پیش آنے کی ترغیب۔ بالخصوص استعماری غلبے کے بعد سے اس فکر کو تقویت پہنچی ہے کہ دنیا میں کسی مخصوص کلچر کو کسی دوسرے کلچر پر برتری قائم کرنے کا کوئی اصولی یا اخلاقی جواز موجود نہیں۔ اضافیت پسندی کے مقدمہ کو بشری علوم کی روشنی میں دیکھا جائے تو انواع و اقسام کے خطوں میں رائج رسوم و رواج کی اہمیت کا اقرار بھی اس کے حق میں جاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف دیکھا جائے تو ان ہی خطوں میں رسوم و رواج کے نام پر ایسے ایسے لغو قوانین بنائے گئے ہیں جو کہ صریحاً غیر انسانی اور انسانیت کی تذلیل کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس نکتے پر اضافیت پسندی کے مقدمے میں جھول پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اضافیت پسندی کو درست مانا جائے تو پھر دنیا بھر کی تمام مضحکہ خیز اور غیر انسانی رسومات کو بھی درست ماننا پڑے گا۔ اضافیت پسندی کی وجہ سے اجتماعی سطح پر تو معاشرے میں موضوعیت در آئی ہی ہے ساتھ ساتھ فرد کی انفرادی زندگی میں اسی کے راستے موضوعیت اور نرگسیت بھی در آئی ہے جو انانیت پسندی کی طرف لے جاتی ہے۔

سائنسز سے برآمد تصورِ انسان

سیکیولر فکر میں موجود "ترقی" اور "اخلاقی ترقی" کے تصورات تضادات سے بھرے ہوئے ہیں۔ جدید حیاتیاتی سائنس میں انسان کو محض حیوان تصور کیا جاتا ہے جو کہ اپنی جبلی خواہشات کے تابع ہے اور ساتھ ہی انسان کے

[1] Alasdair MacIntyre, *After Virtue*, (University of Notre Dame Press, 1981), 38.

عقل کی رہنمائی میں تہذیب یافتہ ہونے کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ ان تمام تناقضات اور تضادات کے باوجود "ترقی کے تصور" کی عام مقبولیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترقی سے وابستہ "ایمان" غیر عقلی ہے۔ نظریۂ ارتقا کے پیش کردہ تصورِ انسان اور اس پر استوار تصورہائے حیات کو دیکھا جائے تو انسان اپنی حیوانی جبلتوں کے ہاتھوں بے بس اپنی بقا کی خاطر مقابلے کی دوڑ میں شامل اپنے جینیاتی نظام کے تحت مجبور اور بے بس جانور سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس نظریے کی رُو سے انسانی فطرت نامی کوئی شے نہیں۔ انسانی زندگی کی تمام اخلاقی اقدار اور خواص وقت کے ساتھ ساتھ سامنے آنے والا موافقت اور مطابقت کا لائحہ عمل ہے جو نیچرل سلیکشن سے ممکن ہوا۔ انسانی اوصاف کے جینیاتی نظام کے تحت متعین اور طے شدہ ہونے کے تصور سے ایک خاص قسم کی جبریت پیدا ہوتی ہے۔ ان نظریات سے مسئلۂ ارادہ واختیار میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ جب سب کچھ جینیاتی ساخت میں متعین ہے تو پھر انسانی اخلاقی نشوو نما اور وعظ ونصیحت کی تمام سرگرمیاں بھی مہمل اور بے معنیٰ ٹھہرتی ہیں، کیونکہ جینیاتی معلومات کو بدلنا ناممکن بات ہے۔

فرانسس کرِک اور بی ایف اسکینر جیسے مفکرین نے فرد کی آزادی کو بالکل ہی رد کر دیا اور خارجی طبیعی ماحول کے جبر کی حمایت میں فکر پیش کی۔ بی ایف اسکینر بنیادی طور پر ایک نفسیات دان تھے، انھوں نے نفسیات کو جدید سائنسی طریقہ کار کے مطابق ڈھالا اور اپنی تحاریر میں معاملات انسانی سے بحث کرتے ہوئے سائنس اور سائنسی کے الفاظ کا بے دریغ استعمال کیے رکھا۔ ان کے نزدیک thing in-itself کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ تمام حقیقت طبیعی اور مادی ہے جسے کِرک کے مطابق طبیعات اور کیمیات کی اصطلاحات میں بیان کیا جاسکتا ہے اور اسکینر کے مطابق انسان کا خارجی ماحول انسانی صورتحال اور ثقافت وغیرہ کا تعین کرتا ہے۔ ان دونوں کے تصورِ اخلاقیات میں انسانی بقا کا مقدمہ گُندھا ہوا ہے۔ سائنسی علوم کے تحت انسانی خصائص اور عادات وخصائل وراثتی طور پر متعین شدہ ہوتے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف یہی سیکیولر فکر انسانی آزادی کا بھرپور پرچار بھی کرتی ہے۔ اس سے سیکیولرازم میں پائے جانے والی خود تضاداتی واضح ہوتی ہے۔ اگر جبر کے پہلو کو دیکھا جائے تو عقلیت پسندی کے علوم بھی غیر عقلی قوتوں کے زیرِ قابو ہیں۔[1]

[1] Anthony O'Hear, *After Progress* (Bloomsbury, 1999), 24-25.

نظریۂ ارتقا

سیکیولر فکر کے متفرق حامی مکاتب فکر کو اگر ایک مشترک نظریہ متحد کرتا ہے تو وہ ہے ڈارون کا نظریۂ ارتقا۔ کیونکہ یہ نظریہ ایک طرف مذہبی عقائد (بالخصوص نظریۂ تخلیق) کا رد کرتا ہے تو دوسری طرف انسانی ترقی اور بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد کے تصور سے بھی مطابقت بھی رکھتا ہے۔ ڈارون کے حیاتیاتی ارتقا کے افکار نے بعد ازاں ہربرٹ اسپنسر کے سماجی ارتقا کو جنم دیا۔ اسپنسر نے جب ان افکار کا سماج پر اطلاق کیا تو بقا کی خاطر جنگ کے لیے ایک نسل کے دوسری نسل پر غلبے اور تسلط کو بھی جواز فراہم ہو گیا۔ اگرچہ ڈارون کو موردِ الزام ٹھہرانا مشکل ہو گا، تاہم اسی کے افکار نے برطانوی اور امریکیوں کے دوسری نسلوں پر ظلم و ستم کرنے کی راہیں ہموار کیں اور بعد ازاں ہٹلر کی صورت میں نسلی برتری کے زعم میں دوسری نسل کے افراد کا قتل عام کرنے کو معقول قرار دینے میں معاونت کی۔[1] اسی طرح نو ڈارون ارتقائی افکار انسان کے بے لوث اور لاغرض اعمال و افعال کو انانیت اور خود غرضی کی پیداوار سمجھتے ہیں۔[2] جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی انسانیت کے لیے پیش کی جانے والی قربانیاں بھی بے محل ٹھہرتی ہیں۔ اس فکر کے تحت جو تصورِ اخلاق اخذ ہوتا ہے وہ غصہ، لالچ، حسد اور ان جیسے متعدد اخلاقی رذائل کو انسانی فطرت کے معمولی خاصے کے طور پر پیش کرتا ہے۔

اب اگر انسانی اعمال اس کے جینز کی ساخت نے متعین کرنے ہیں تو پھر نیک اخلاق اور بد اخلاق کے حامل کردار کا بیان ہی بے محل ٹھہرے گا۔ نہ ہی اخلاقیات کا کوئی معیار یا پیمانہ مقرر ہو سکے گا۔ ان تصورات سے عمومی رجحان یہ پیدا ہوتا ہے کہ جیسے اخلاقیات کا سارا نظام سوائے التباس کے کچھ بھی نہیں۔ جس کا لازماً نتیجہ اخلاقی انحطاط ہی نکلتا ہے۔ نظریۂ ارتقا سے قائم کیا جانے والے تصورِ کائنات کو قبول کرنے میں اس کے حامی مفکرین بھی جھجک محسوس کرتے ہیں کیونکہ اس میں ذات، اخلاقیات اور معنویت جیسی مباحث بالکل ہی بے معنی ثابت ہوتی ہیں۔ نظریۂ ارتقا نے انسانی قدر و منزلت کو بہت حد تک گرایا اور اسے محض حیوان کے رتبے پر لا کھڑا کیا۔

---

[1] Richard Weikert, *From Darwin to Hitler: Evolutionary Ethics, Eugenics and Racism in Germany* (Palgrave MacMillan, 2006).

[2] Keith Ward, *The Battle for the Soul: The End of Morality in a Secular Society* (Hodder and Stoughton, 1985), 60.

مادیت پسندانہ اخلاقیات

مغربی تصورِ انسان میں ایک عنصر ایسا ہے جو مذہبی تصورِ انسان سے ان کی اصولی مغائرت کو اور بڑھا دیتا ہے۔ مغرب آدمی کو بھی مادی دنیا پر قیاس کرتا ہے۔[1] یعنی ایک ہی نظام وجود ہے جو کائنات میں بھی کار فرما ہے اور انسان میں بھی۔ اس وجہ سے ان کا تصورِ اخلاق بھی ایک پہلو سے میکانکی یعنی جبری ہے، اور دوسرے زاویے سے افادی یعنی اضافی ہے۔ مغرب کے تناظر میں انسان وجود کے اعتبار سے موجودیت کے خارجی System سے کوئی امتیاز نہیں رکھتا۔ تاہم حاملِ شعور و وجود ہونے کی حیثیت سے اسے انتخاب کا چیلنج درپیش رہتا ہے۔ انسان کو وجود و شعور کے مجموعے سے تعبیر کرنے کا یہ عمل بالکل درست ہے، لیکن مغرب نے ان کے درمیان ایسی دولختی پیدا کر دی ہے جس کی وجہ سے انسان کی کوئی ایسی تعریف ممکن نہیں رہی جو غیر متغیر اطلاقی حالت میں اس کی کلیت کا احاطہ کر سکے۔ انسان وجود میں مطلق اور شعور میں اضافی ہے۔ یہ ایک ایسا مفروضہ ہے جسے مان کر یہ کہنا صحیح ہو جاتا ہے کہ انسان ایک چیز ہے جو دوسری چیزوں سے اتنی سی بات پر ممتاز ہے کہ یہ خود کو چیز نہ سمجھنے کا تخیل باندھ سکتا ہے۔ مغرب چونکہ انسان کو تعلق بالخلق کے دائرے سے باہر مانتا ہی نہیں، لہذا اس کے لیے اخلاق وغیرہ میں اضافیت کا موقف رکھنا عین فطری ہے۔

پرستانہ اخلاقیات کی تکون کی رُو سے نہ ہی کسی مافوق الفطرت ماوراء ہستی کا وجود ہے، خیر و شر کا کوئی معیار طے شدہ نہیں، انسانی اعمال کی معنویت کا کوئی تعین نہیں۔ محض نتائجیت پسندانہ رویوں اور تکنیک کی ترویج نظر آئے گی جو محض مقابلے کی دنیا میں آدمی کے لیے بقاء کا سامان فراہم کر سکیں۔ جہاں تک اعمال کی سرانجام دہی کے سیاق و سباق کا تعلق ہے وہ تاریخی دھارے سے کٹا ہوا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کی نگران مابعد الطبیعی حقیقت ہی کوئی نہیں۔

تصورِ خدا کی بے محلیت

روایتی یا مذہبی ادوار میں اخلاقیات کا مذہب سے گہرا تعلق موجود رہا ہے۔ شروع سے اخلاقیات کے بارے یہی تصور رہا ہے کہ، اخلاقیات نہ صرف مذہب سے جڑی ہوئی ہیں بلکہ ان کی تشکیل سازی اور انتظام و انصرام مذہب کی

[1] Kevin Corcoran, *Rethinking Human Nature: A Christian Materialist Alternative to the Soul* (Baker Academic, 2006).

بدولت ہی ممکن ہوتا ہے۔ اس فکر کے حامل لوگ اخلاقیات کے ضمن میں زیادہ نظریات کی عمل پیرائی سے واقف نہیں تھے کیونکہ ان کے ہاں ایک صالح زندگی بسر کرنے کے لیے ہدایات کی صورت میں ایک رہنمائی موجود رہتی تھی۔ یہ رہنمائی مافوق الفطرت ذات یعنی خدا کی طرف سے وحی کی صورت میں انسانوں سے مخاطب ہو کر بھیجی جاتی تھی۔ خدا کے پیغام یا ہدایت کو بنی نوع انسان تک بہم پہنچانے کی ذمے داری پیغمبروں پر عائد تھی۔ خدائی احکام کی نافرمانی یا حکم عدولی سزا پر منتج ہوتی۔ انیسویں صدی عیسوی کے مغرب میں جب مذہبی ایمانیات نے اپنا اثر کھونا شروع کیا تو کئی مفکرین نے محسوس کیا کہ اب اخلاقیات بھی مذہب کے ساتھ روانہ ہو چکی ہیں۔ مغرب میں منطق، سائنسی علوم، اور سائنسی طریقہ کار پر قائم سماجی علوم میں نت نئی تحقیقات ہونے لگیں تو مسیحی احکام (بالخصوص عہد نامۂ قدیم) کو باطل اور لغو سمجھا جانے لگا جو جدید عہد کے سوالات کے جوابات دینے سے قاصر ہیں اور نہ ہی وہ دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے نظر آتے تھے۔ مسیحی اخلاقیات میں کئی نقائص کی نشاندہی کی جانے لگی۔

مسیحی اخلاقیات پر جارحانہ انداز میں جس فلسفی نے حملہ کیا وہ فریدرک نطشے ہے۔ اس نے مسیحیت کو ایک تاریکی قرار دیا جو انسانی اقدار، آزادی، تفاخر، جذبے اور دانش کی مخالف ہے۔ اس کے نزدیک مسیحی اخلاقیات، تناقضات سے لبریز مبحث کی مانند ہیں۔ کلاسیکی دور میں مذہب، خدائی احکام اور اخلاقیات کے باہمی ربط پر پہلی نقد افلاطون نے اپنے مکالمہ یوتھیفرو میں کی جس کی رُو سے ہم نیکی اور بدی کے اعمال کو خدا کو منسوب کیے بغیر آزادانہ طور پر سرانجام دیتے ہیں۔ جدید دور کے ایک جید فلسفی کانٹ کے تصورِ اخلاقیات میں خیر اور بھلائی کے اخلاقی افعال کی انجام دہی میں سزا و جزا کی پروا کیے بغیر اور مافوق الفطرت ہستی کو خاطر میں لائے بغیر ایک ڈیوٹی اور اصول کو ملحوظِ خاطر رکھنے کی تلقین پائی جاتی ہے۔

مغرب کے سماجی اور ریاستی مظاہر مغرب کے اس دعوے کو تقویت پہنچانے کے سوا کچھ نہیں کر رہے ہیں کہ خدا کو ماننا نہ صرف یہ کہ اخلاقی لازمہ نہیں ہے بلکہ انسان کے اخلاقی وجود کی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔[1]

نفسیاتی اخلاقیات

جدید انسان کے باطنی خلا کو پُر کرنے کے لیے جدید نفسیات نے جدید معاشروں میں ایک مقبولِ عام نظام کے طور پر

[1] Otto Pfleiderer, "Is Morality without Religion Possible and Desirable?" *The Philosophical Review* 5, no. 5 (1896): 449-472.

اپنے آپ کو منوایا ہے۔ جدید سائنسی طریقۂ کار کو اپنا کر اپنا نظامِ فکر قائم کرنے والی جدید نفسیات نے اپنے آپ کو مذہب کے متبادل کے طور پر پیش کیا ہے۔[1] جدید نفسیات کی تصورِ انسان کی تاویلات اور اس کے ضمن متعارف کردہ 'تھیراپی' کے پورے نظام نے جدید آدمی کو اور زیادہ پریشانیوں میں الجھا کر رکھ دیا ہے۔

جدید اخلاقیات کے ضمن میں ہمارا مقدمہ

تصورِ اخلاق کا براہِ راست تعلق اس سوال سے ہے کہ انسان کیا ہے؟[2] انسان ایک سماجی وجود ہے، انسان ایک عقلی وجود ہے یا محض طبعی وجود ہے جس میں شعور اور اجتماعیت وغیرہ اتفاقی طور پر در آئے ہیں؟ ہمارا موقف یہ ہے کہ انسان بندگی کی اصل پر قائم ایک سماجی وجود ہے، یعنی انسان انفرادیت اور اجتماعیت دونوں سطحوں پر ان شرطوں سے خالی نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اس حیثیت میں ایک اس کی تنہائی ہے، اور ایک معاشرت۔ اخلاق ان تینوں زاویوں سے انسانی شخصیت کی تشکیل کے اسباب اور نتائج ہیں۔ تعلق باللہ سے تربیت پانے والا اخلاقی وجود ہی سماجی ہونے کے ہر طرح کے تقاضے پورے کرتا ہے، وہ تقاضے مذہبی بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مذہبی بھی، یعنی تہذیبی و عرفی وغیرہ بھی۔ مسلم تصورِ اخلاق میں انسانوں کے باہمی تعلق کو خیر کے ماحول میں پروان چڑھانے والی تمام قوتیں وہی ہوتی ہیں جو تعلق مع الحق سے حاصل ہوتی ہیں اور اسی حوالے سے اخلاقی اصالت، سند اور اہمیت اخذ کرتی ہیں۔ تعلق باللہ کے آداب سے بے بہرہ ہو کر انسانی تعلقات کا نظام اخلاقی پیمانے پر نہیں چلایا جا سکتا۔[3]

ہمارا مقدمہ یہ ہے تعلق باللہ کے بغیر اخلاق یعنی نظامِ تعلق کے وسائل کی نہ کوئی معنویت ہے نہ اصلیت۔ اللہ سے تعلق اخلاقی وجود کا مستقل مسلمہ ہے جس سے خالی یا منکر ہو کر اخلاقی تشکیلات کا کوئی طریقہ محض بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اس میں جواب دہی کی حقیقی حالت کا شعور اور تصور ہی نہیں پایا جاتا۔[4] یہی وجہ ہے کہ تمام غیر مذہبی اخلاقی نظام نفسیاتی طور پر خود غرضی اور اجتماعی سطح پر ایک قانونی جبر یا تاجرانہ مینجمنٹ پر استوار ہیں جب کہ حقیقی اور

---

[1] Paul C. Vitz, *Psychology as Religion: The Cult of Self-Worship*, (Lion Publishing, 1979).

[2] Dorothy Walsh, "Ethics and Metaphysics," *International Journal of Ethics* 46, no. 4 (1936): 461-72.

[3] Richard Swinburne, "What Difference Does God Make to Morality?" in *Is Goodness without God Good Enough?* (Rowman and Littlefield, 2008), 151-63.

[4] Jacob Gould Schurman, "The Consciousness of Moral Obligation," *The Philosophical Review* 3, no. 6 (1894): 641-654.

اجتماعی سطح پر ایک قانونی جبری نظام اپنی اصل میں انفسی ہوتا ہے اور مظاہر میں آفاقی۔ مغرب چونکہ طاقتور ہے اس لیے اس نے اپنی طاقت کا اس دائرے میں یہ استعمال کیا ہے کہ آفاق، انفس پر اتنا غالب کر دیا ہے کہ انسان کی باطنی ساخت بے معنی اور بے مصرف ہو کر رہ گئی ہے۔[1] ہر چیز ایک آرڈر کا حصہ بن کر رہ گئی ہے اور وہ آرڈر اشیائی اور خارجی ہے۔ اسلام میں انسان باعتبارِ کل ایک باطنی وجود ہے جس کا خارج میں جزوی اظہار ہوتا رہتا ہے۔ مغرب نے انسان کی اس وجودی اور حقیقی کلیت کو جہاں اور مقامات پر توڑا وہیں اجتماعی سطح پر ایک قانونی جبری سطح پر بھی اسے ایک میکانکی وجود بنا کر رکھ دیا۔[2]

خلاصہ بحث

مختصر یہ کہ انسان کی اخلاقی فطرت پر ستتش کے اصول پر اپنا اظہار کرتی ہے۔ اب یہ پرستتش دنیا کی ہو تو مغرب کا نظام الاخلاق پیدا ہوتا ہے اور اللہ کی ہو تو اسلامی۔ اصول بہر حال واحد ہے کہ اخلاق کی ایک مستقل غایت ہوتی ہے وہ چاہے آپ خدا کو بنالیں یا دنیا کو۔

---

[1] James B. Glattfelder, "The Consciousness of Reality," in *Information-Consciousness-Reality* (The Frontiers Collection, Springer, Cham, 2019), 523.

[2] Robert Bickel, "Modernity and Its Discontents: A Suitably Ironic Closing," In *Peter Berger on Modernization and Modernity*. 1st ed., (London: Routledge, 2017).